کامران ندیم کی غزل عصرِ حاضر کی ترجمان

The Ghazal of Kamran Nadeem: A Reflection of Modern Times

زینب آفتاب * ، ڈاکٹر صدف نقوی **

Abstract:

Kamran Nadeem belonged to Halqa Arbab e Zauq New York. His poetry is the representation of the current modern era. Kamran Nadeem's poetic expression is also unique because he wrote ghazals in the shortest verses. Kamran Nadeem raises knowledge & revolt against human exploitation. Kamran Nadeem is a progressive poet in the traditional sense. The yearning for social advice is seen in his poetry. The social aspect is very prominent in the poetry of Kamran Nadeem. The helplessness of the situation is realized in his poetry. The romantic aspect is very prominent in the poetry of Kamran Nadeem. Kamran Nadeem Faiz was also greatly influenced by Faiz Ahmed's poetry. He has brought new innovation to the subject of love and romance in Urdu Ghazal.

Key Words: Ghazal, Present Age, Progressive, Enlightenment, Human Exploitation

کلیدی الفاظ: غزل، عصرِ حاضر، ترقی پسند، انقلاب معاشرت، انسانی استحصال۔

کامران ندیم کا تعلق حلقہ اربابِ ذوق، نیویارک سے تھا۔ حلقہ اربابِ ذوق، نیویارک وطن سے دور اُردو

* ایم فل اسکالر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی فیصل آباد

** صدرِ شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی فیصل آباد

ادب کے فروغ کے لے کوشاں رہے۔ کامران ندیم کی شاعری وقت کے بحران کی شاعری ہے۔ یہ ایک ایسا شعری محاکمہ ہے کہ جو صرف اپنے عہد کا ہی نہیں بلکہ تمدنی حرکیات میں پوشیدہ انسانی معاشرت اور دہشتوں کا منظر نامہ ہے۔ ان کے شعری احساس واظہار میں تمثالیت کے رنگوں کے امتزاج کی نقش نگاری کچھ اس طور پر اپنا تاثر چھوڑتی ہے کہ یہ تمثالیت اور ڈرامائیت کے فن میں داخل ہو کر اپنے ہاتھوں اپنی روایت کو تخلیق کرنے لگتی ہے۔ فرد کی داخلی وحشت راہوں کے ابہام میں مزید اُلجھ کر اپنے آپ میں سمٹ کر ایک قفس میں مقید ہو کر رہ جاتی ہے۔ وحشت کا اثر دل پر یہ ہوتا ہے کہ وہ شعر و فکر کو سیر اب کرنے لگتی ہے۔ شاعر کے دل میں جذباتی تموج ہوتا جو کہ ایک عام انسان میں پایا جاتا ہے۔ مگر وہ ایک ہی معاملے کو ایک ہی مزید عمیق تناظر میں دیکھنا اور سمجھنا چاہتا ہے اور شاعر وحشت ہی سی دل و عقل کو شعورِ ذات بنالیا ہے۔

چاکِ دل ہے کمال وحشت کا
ہے یہی اندمال وحشت کا[1]

ماحول کے بکھرے ہوئے سالمات سے اپنے جمالیاتی اظہار کو شعر میں سمونا شعراء کا ہمیشہ سے دل پسند مشغلہ رہا ہے۔ شاعر باہر کی کائنات کو اپنے وجود میں سمو کر قنوطیت کا احساس تو دلواتا ہے مگر مہاجرت کا اذیت ناک تجربہ ایک ناسٹلیجیاتی کیفیت کا منصوبہ بھی دیتا ہے۔

دبکتی آگ پہ چلتے تو ایک عمر ہوئی
اب اور کتنا ہے ہم عذاب در بدری[2]

نصیر احمد ناصر لکھتے ہیں:

> ''کامران ندیم کی شاعری بظاہر فیض احمد فیض کی شعری روایت کا تسلسل معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں جھلک بھی آسانی اور فراوانی سے دیکھی جاسکتی ہے جسے کامران نے اپنے فکری عناصر، اپنے تجربے اور مشاہدے کے رنگوں اور جذبوں سے آمیختہ کیا ہے۔''[3]

کامران ندیم نے شاعری کو محض شوقیہ شعری لذت کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ برسوں ان افکار و خیالات کی اپنے اندر پرداخت کی ہے اور تخلیقی کاہش اٹھانے کے بعد انھیں قرطاس پر اُتارا ہے۔ جس دور میں لوگ ایک دوسرے کے استحصال میں لگے ہوں۔ جہاں انسان کم اور ویمپائر زیادہ ہوں وہاں الفاظ کی صورت گری خونابہ فشانی سے کم ہیں۔ کامران ندیم نے سوچتے ذہن اور جاگتی آنکھوں کے ساتھ یہ کار خیر یعنی کئی نسلوں کو خون بہا چکانے کے لیے قلم اٹھایا ہے۔ یوں کامران ندیم کے شعری امکانات اپنی نوعیت میں جتنے واضح اور مقصدیت کے قریب تر ہیں اتنے ہی

شعری اسرار کے حامل ہیں۔

جب شاعر کو اپنی معاشرتی خطا کا احساس ہوتا ہے جو خاصلاتی واہموں کا التباس ہے۔ جہاں دوریوں سے کریہہ چیز بھی خوبصورت اور جاذب نظر لگی ہے۔ ساختوں کا طلسم جب ٹوٹتا ہے۔ تو وہ بہت اذیت ناک ہوتا ہے۔ ان کی شاعری تخیل کا ایک ایسا ادراک ہے کہ جس میں نقش محدود ہوتے ہوئے بھی لا محدود ہے۔ کینوس بہت پھیلا ہوا ہے۔ انتشارِ ذہن تو ہے مگر شعری احساس میں بو قلمونی بہت ہے۔ شعور کی رو اس شعری احساس میں لاشعور کی روح میں تبدیل ہو کر ایک ایسی شعری تجریدیت تشکیل کرتی ہے جو تخیل ادراک میں شعریے کو جنم دیتی ہے۔ دراصل یہ تمام شعری، مغائرت کے رد عمل کا دوسرا روپ کہ جو ایک شدید مزاحمت کرنے والے شاعر کا احتجاج ہے۔ جہاں فرد ایک مقید معاشرے میں سک رہا ہے اور وہ اسے اندھے کنویں کی تنہائی کہتا ہے۔

کامران ندیم کی شاعری کا بنیادی نفس مضمون ''دہشت'' ہی ہے۔ یہ دہشت خوف اور ڈر سے مختلف ہے۔ اس میں ایک لایعنیت (Absusdism) بھی ہے اور ایک جمالیاتی دکھ اور کرب کا احساس بھی ہے۔ یعنی دنیا میں انسان ہے تو مگر یہاں انسان نام کی کوئی چیز ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شعر میں ڈھلتی ہوئی دہشت آزادی کی سبلی (انکاری) ہے مابعد الطبیعاتی آفاق میں شاعر کے تناظر میں دھندلی ہے۔ جو تشکیک سے عبارت ہے مگر یہ التباس ہے جو موضوعیت کا دھوکہ ہے۔ شعر کا جمالیاتی تجربہ شعری متن کا سب سے اہم حصہ ہوتا ہے جو در صل ثبات و سکون ہوتا ہے، مگر اس میاطوفان پوشیدہ ہوتا ہے جو انسانی تجربے کی مکمل اور مستحکم وحدت ہے جو ایک وجودی بحران کا عندیہ دیتا ہے۔

سر پٹکتے ہیں یہ زندانی کیوں
کیا کوئی خوب سرا ہے باہر(۴)

اس شاعری میں ایک ایسی قنوطی خود کلامی کی حالت نظر آتی ہے۔ جو دراصل زندگی کی روشم اُمنگوں کی گہری مغائرتی خود کاریت کی کیفیت کا اظہار کرتی ہے۔ بنیادی طور پر ان کی شاعری جدید دور کے کرب واذیت کی تثلیث کی نئی جہات دکھاتی ہے۔ جن میں درد افسردگی، خیال اور اُمید شامل ہیں۔

ان کی شاعری کے مطالعہ سے علم ہوتا ہے کہ معاشرے میں فرد تنہا اور لاعلم ہے اس کی اپنی شناخت اور متعین راہ کھو چکی ہے۔ اگرچہ ان کی غزلیں کلاسیکی غزل کی روایات میں کندھی ہوئی ہیں لیکن ان میں جدید دور کا المیاتی لہجہ لاتشکیلیت کی سطح ہر تصوراتی التباس کو اُبھارتا ہے۔

دشت جاں میں رقص بسمل

چار سو کرتے رہیں گے

چار جانب ہیں بچھے دامِ شنیدن پھر بھی
مرغِ آشفتہ نوا بول رہا ہے کوئی(۵)

کامران ندیم کا شعری اظہار اس لیے بھی منفرد ہے کہ انھوں نے مختصر ترین بحروں میں غزلیات کہی ہیں اور بات کا احساس دلوایا ہے کہ ردیف اور قافیہ بازی کے کھیل میں خیال و جذبات کو سب سے مقدم رکھنا ہی شعری حسن ہے۔ ان کی شاعری ''لاشہ'' نہیں بلکہ اصل میں سانس لیتے ہوئے انسان کی شاعری ہے جس میں آفاق سے آہنگ و لفظیات کے پھول توڑے جاتے ہیں وہ لفظیات کے اس ذخیرے میں نہیں جاتے جہاں سے الفاظ کو اٹھا کر شاعری سے متصادم کر دیا جاتا ہے جن سے پامال کلمات (کلیشے) کی بو آتی ہے۔ ''وحشت ہی سہی'' میں اسی سبب ''اقوا''، ''افقا''، ''سناد''، ''ایطاء'' اور ''اجازہ'' کے شعری عیوب نہیں ہیں اس مخزن میں شاعر کے شعری تجربے سے انفرادی نقش ابھرتے ہیں جو قاری کے اجتماعی شعور کا حصہ بن کر تہذیبی و معاشرتی المیات کا منظر نامہ ترتیب دیتے ہیں جو کہ موضوع اور مورض کا رزم نامہ بھی ہے۔

وہی سر ہے وہی سودا وہی وحشت ہے میاں
اب بھی آجاؤ کہ دل کی وہی خلوت ہے میاں

وسعتِ دید سمٹنے ہی ہیں پاتی ہے
چشمِ آہو سے ہمیں آج بھی نسبت ہے میاں

عمر جب ہجر مسلسل کی مسافت میں کٹی
یہ بھی کٹ جائے گی اک دن شب فرقت ہے میاں(۶)

کامران ندیم نے شاعری کی مراقباتی سطح سے باطن اور ظاہر کو کھنگالا ہے۔ وہ وجودی زاویے کے انکشافات سے بغل گیر ہوتے وقت اشیا اور مظاہر کے مابین موجود مرئی اور غیر مرئی رابطوں اور فاصلوں کو باصرہ (دیکھنے کی سطح) کی سطح پر محسوس کر کے الفاظ کا منظر نامہ بناتے ہیں۔ وہ اظہار و تجسس کے حلقے اور فکری و تخلیقی عمل کو وسیع کرنے کے لیے تجربے اور مشاہدے کا دامن تھامتے ہیں۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہر گانوی لکھتے ہیں:

''ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیت سچائی کی خوشبو کی شمولیت ہے، کیونکہ انھوں نے تصورات وخیالات کا پیراہن بُننے کے بجائے حال کی برہنہ حقیقتوں کو سچائی سے بیان کیا ہے۔اس لیے انھوں نے جو منفرد لہجہ اختیار کیا ہے اس میں ان کے دل کی تمام لذتیں اور کڑواہٹیں شامل ہو گئی ہیں۔ جنھیں وہ لفظوں کے نوحے کو عبور کرنے کی کوشش کرنے کی سعی میں مصروف ہیں۔''(۷)

ان کی غزلیں منجمد تصورات کے بجائے زمانے سے ہم آہنگ ہیں۔انھوں نے محسوسات کو لفظ وصورت میں مقید کیا ہے۔اب کی غزلوں میں لفظ ''وحشت''اور ''خواب'' جہتیں اور زاویے رکھتے ہیں۔وحدت اور یگانگت سے بھرپور شناخت اور پہچان دیتے ہوئے لفظ خواب کے تنوع سے ان گنت شیڈز دکھاتے ہیں۔ان کی غزلوں میں وحشت نظر آتی ہے اور خستہ تن کی خوشبو، باطنی حسن کے مساموں سے رات کی رانی کا نوحہ سن کر ڈھلتی ہے۔

شاعری کی تخلیق ایک ذہرا عمل ہے۔ پہلا مرحلہ تخلیق کا نموپذیر ہونا ہے۔ یہ عمل ایک وجدانی اور لاشعوری تحریک کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ دوسرا مرحلہ تخلیق کی تہذیب اور پرداخت کا ہوتا ہے، اس میں کافی حد تک شعوری کاوشیں درکار ہوتی ہیں شاعری ایک پُراسرار تخلیقی عمل ہے۔زندگی کے تجربات شاعرانہ تخلیق گاہ میں جا کر کہیں چھپ جاتے ہیں۔ جہاں زندگی کے مختلف النوع تجربات اور واقعات بیک وقت تخلیقی نمو پا رہے ہوتے ہیں۔ اب ان میں سے کون سا خیال پہلے نموپذیر ہوتا ہے اور کون سا بعد میں، اس کا تعین جذبہ، فکر یا سوچ کی شدت پر مبنی ہوتا ہے۔ عموماً زیادہ شدت کے حامل تخلیقی تجربات کم شدہ کے حامل تخلیقی تجربات سے جلد نموپذیر ہوتے ہیں۔ بعض اوقات تخلیقی عمل ایک رد کی شکل میں آتا ہے ایک ساتھ کئی چیزیں تخلیق ہوتی ہیں اور کبھی کبھی ہفتوں بلکہ مہینوں تک معنی کی سرزمین پر نزول سروش نہیں ہوتا۔ تخلیقی عمل مکمل ہونے کے بعد اس کے پرداخت کا مرحلہ بھی نہایت اہم ہوتا ہے، جس کا شاعر کی تحقیقی مہارت، شعری مطالعہ و تجربہ سے گہرا تعلق ہے۔ نامیاتی، جمالیات اور جدلیاتی الفاظ کا استعمال شعر کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد کرتا ہے۔

اچھی شاعری کرنے کے لیے جہاں کلاسیکی اور ہم عصری شاعری کی ہائیت وحسیت سے بھرپور ربط ضروری ہے وہیں شاعر کے لیے نثری ادب، تنقید دیگر زبانوں میں تخلیقی ہونے والے ادب، موسیقی، فلسفہ، نفسیات، تاریخ، سماجیات اور ایسے ہی دیگر مضامین کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ شعری پیکریت کے سلسلے میں ایک سوال جمالیات کے بارے میں اٹھایا جا سکتا ہے، اس میں معنوی اور لفظی جمالیات دونوں شامل ہیں۔ جمالیات کی اپنی تسطیری روایت ہے جو تشکیلیت پذیر ہوتی ہے۔

تخلیق سازی خاص طور پر شاعری میں جمالیاتی امکانات موضوعی بھی ملیں اور معروضی بھی۔ جہاں محاکاتی اور تخیلاتی پرواز و تموج شعری جمالیات کا تعین کرتی ہے وہ لفظیاتی، تشبیہاتی، استعاراتی اور پیکریت کا تنوع شعری جمالیات گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کرتا ہے۔

اردو شاعری میں اور بالخصوص پاکستانی شاعری میں تراجیت کا اظہار علامتی سطحی پر زیادہ ہوا ہے۔ لیکن کامران ندیم کے شعری رویوں میں نراجیت، سریلزم، مستقلیت، لبرل ازم اور سوشلزم کے خمیر میں گوندھی ہوئی ہے۔ان کے ہاں ان مروجہ اخلاقی رویوں سے بیزای بھی ہے کہ جو ثقافت کی ملمع سازی کے باعث پیدا ہوتے ہیں۔ان کی شاعری میں فرد کی آزادی کا جو تصور پوشیدہ ہے وہ دراصل برل نراجیت کے زمرے میں آتا ہے۔جوہر عمرانی، سیاسی، معاشی اور ثقافتی انقلاب کے پس منظر میں پوشیدہ ہوتا ہے:

کسی وحشت میں پھر آباد ہونا چاہتا ہوں
میں اس کی قید سے آزاد ہونا چاہتا ہوں
پُرانی شکل صورت گرملامت بن گئی ہے
نئی مٹی سے پھرا یجاد ہونا چاہتا ہوں(۸)

''وحشت ہی سہی'' کی شعری کائنات کثیر الجہت ہے، زیست کا کانٹا شاعر کے شعری احساس میں جابجا گڑا ہوا محسوس ہوتا ہے۔یہی کرب و درد مخصوص قسم کی لایعنی کیفیت کو تو اُبھارتا ہے مگر ان کے یہاں زندگی کے کرب و بے اطمینانی کا مثبت شعری اظہار اور انسانی صورتِ حال کی کربناکی زندگی کی معنویت کا ایسا منظر نامہ خلق ہوتا ہے کہ معنیات اور مفاہیم کے نئے کلیہ کی تخلیق ہوتی ہے۔کامران ندیم نے اپنی شاعری یعنی غزل میں بارہار ''وحشت'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ذہنی کرب کے سبب ان اشعار میں بسا ہوا انسان بذاتِ خود ایک معمہ بن جاتا ہے اور وہ ایسے سوال کرنے لگتا ہے جو عام زندگی میں اذیت ناکی سے عبارت ہیں۔اس موقع پر فرد قدر و اختیار کے سکڑتے ہوئے دائرے کی تکلیف دہ صورت حال میں شدید قسم کے جذباتی خلفشار سے دوچار ہوتا ہے۔''کرب'' کے قدموں کی چاپ وہ پہلے ہی بھانپ لیتا ہے۔

کرب کے قریب ہے
زندگی عجیب ہے
ملگجی سے روشنی
کیوں مرا نصیب ہے(۹)

کامران ندیم کا تعلق پاکستان کی اس نسل سے ہے جس نے پہلے سپہ سالار کے سبز دور ہیں آنکھ کھولی، لڑکپن کی سیڑھی پر قدم بھی نہیں رکھا تھا تو معلوم ہوا کہ ان کا مر نیم روز، مہر دو نیم کر دیا گیا، اب دوسرت سپہ سالار کا دورِ ناہ نوش برپا تھا۔ ویسے تو پاکستان میں پیدا ہونے والی کوئی بھی نسل اس اعزاز سے تاحال محروم نہیں لیکن ان کے ہم عصر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں کہ تیغوں کے سائے میں پل کر جواں ہوئے تھے۔ جس کا وہ عالم کر پرندے گھونسلوں میں گھٹ گھٹ کر مرنے لگے تھے۔

جب یکایک ہر طرف اندھیرا چھا جائے تو چند لحظوں کے لیے آنکھیں بجھ سی جاتی ہیں۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ اندھیرے کی لینڈ اسکیپ سے مناظر اُبھرنا شروع ہوتے ہیں۔ اس کی دہائی میں ''زیر زمین'' علمی، سیاسی اور ادبی حلقوں تک رسائی ہوئی اور زندگی کی تعلیم و تفہیم کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ زندگی، کائنات، وقت اور انسان کے بارے میں جو نقش و نگار روایتی سماج دو دہائیوں تک ذہن میں بنائے وہ علم کے بچھرے سمندر کے ایک ہی ریلے سے ریت کے گھروندوں کی طرح مسمار ہو گئے۔ انہی دنوں علم ہوا کہ پسِ نوآبادیاتی دنیا میں پسماندہ ممالک کے یہ شمشیر بکف صیاد بھی کسی اور کے دام ہوا سیر ہوتے ہیں۔

بقول عرفان صدیق:

قید کرتا ہے کسی اور کی مرضی سے مجھے
خود بھی صیاد گرفتار ہے میں کیا جانوں(۱۰)

کامران ندیم کی شاعری عہد حاضر کی عکاس ہے انسانی استحصال کے خلاف علم و بغاوت بلند کرتے ہیں۔ روایتی معنوں میں کامران ندیم ایک ترقی پسند شاعر ہیں۔ ان کا رویہ نظریے کی سطح پر بھی اور عمل کی سطح پر بھی کہ وہ اپنے ارد گرد ہونے والی تبدیلیوں کی نہ صرف موضوع سخن بناتے ہیں بلکہ ان کے بارے میں اپنی سوچ اور فکر کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ ان کی بصیرت اور نظریات کا عکس ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں معاشرتی اصلاح کی تڑپ نظر آتی ہے۔

بقول بیدل:

حاصلم زین مزرع بے برنمی دانم چہ شُد
خاک بودم خون شُدم دیگر نمی دانم چہ شُد(۱۱)

کامران ندیم کی شاعری میں انقلابی رنگ نظر آتا ہے ان کی شاعری میں بھی وحشت کا لفظ اس لیے بارہا استعمال ہوا کیونکہ وہ اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ دنیا کی تاریخ جو انسان کی دشمن رہی ہے ظلم، جبر اور حرص و حوس

اور نا ختم ہونے والی جنگ کا جو سلسلہ ہزاروں سال پہلے شروع ہوا وہ ختم ہونے میں نہیں آرہا۔ اکیسویں صدی میں رہنے والا انسان زندگی کی لایعنیت کے بارے میں بجا طور پر سوال کر سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ اس بات کی امید کرتے ہیں کبھی نہ کبھی حالات ضرور بدلیں گے۔ کامران ندیم عہد حاضر سے متعلق ان سے وابستہ مسائل اور تکلیفوں کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ جو کہ ان کی بصیرت اور منی پختگی کی علامت ہے۔

ادب ایک سماجی عمل ہے۔ اس کے ذریعے ہم زندگی کے نئے معنی اور شعور حاصل کرتے ہیں۔ انسان نئے نئے خواب دیکھتا ہے اور ان دیکھی بلندیوں تک پہنچنے کے لیے نئی نئی تمنائیں اور آرزویں کرتا ہے۔ ماضی کو حال اور حال کو مستقبل سے جوڑ کر زمانے کو ایک اکائی کی شکل دیتا ہے۔ جس ادب پارے میں تینوں زمانوں کی روح کی آمیزش ہوتی ہے وہ ادب پارہ اسی مناسبت کے ساتھ بڑا ہوتا ہے۔ بڑے ادیب نہ صرف عصری آگہی کو آنے والے دوروں کے ساتھ ملا دیتے ہیں بلکہ ہر زمانے اور ہر دور کی رو کے ترجمان بن جاتی ہیں:

کچھ زلف ہوا پیچاں اے میر نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی(۱۲)

کامران ندیم کی شاعری میں معاشرتی موضوع کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ کامران ندیم معاشی حوالے سے کہتے ہیں۔ کہ صارفیت کا رجحان پسِ نوآبادیاتی کارپوریٹ دنیا کی معاشی اور تمدنی پہچان ہے۔ صارف معاشرے میں انسان کو اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے اعلیٰ انسانی اقدار کی نہیں بلکہ اچھی سیلز میں شپ کی ضرورت ہوتی ہے جیسا کہ بازار کاری، افادی گروہ بندیاں، اشتہار بازی اپنی مصنوعات کو زیادہ سے زیادہ صارفین تک پہنچانے کی کوشش کی۔ بازار کاری کا یہ رویہ زندگی کے تماشبوں کو اپنے لپیٹ میں لیے ہوئے ہے اور ظاہر ہے کہ اردو شاعری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، بلکہ آج وہی شاعر اہم سمجھا جاتا کہ جس میں بازار کاری اور تشہیر ذات کی یہ اعلیٰ صلاحیتیں موجود ہوں۔

کامران ندیم جانتے ہیں کہ صاحبِ دل لوگ ختم ہوتے جارہے ہیں۔ ہر طرف خوف و دہشت کی فضا طاری ہے کہ شام سے پہلے بازاروں کی رونقیں ماند پڑ گئی ہیں۔ ان کو اپنے شہروں کے اُجڑنے کا نہایت غم ہے وہ سوچتے ہیں کہ یہ ہولناک ظلم کب ختم ہوگا۔

شاعری اظہار ذات ہے، شاعری نامعلوم سے معلوم اور معلوم سے نامعلوم کی جانب ایک سفر ہے جو کہ اپنی ذات سے مکالمے کی صورت میں پیدا ہوتی ہے۔ باہر کی دنیا حلقہِ دام خیال نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت کا نام ہے۔ ہمارے حواس ہماری اور اس حقیقت کے درمیان ایک رابطے کا کام دیتے ہیں۔ شعر وجدان ہمارے اندر کی دنیا کی تماشا دکھاتا ہے۔ باہر کی حقیقتوں کو اندر کے تجربوں سے ہم آمیز کرنے اور اندرونی کرب کو بیرونی حقیقت وادراک کے

حوالے سے پرکھنے کے عمل کے دوران شعری تخلیق ہوتی ہے۔

اک تسلسل سے رائگانی ہے
زندگی بھی عجب کہانی ہے

سر میں سودا نیا سمایا ہے
دل میں وحشت وہی پرانی ہے

تجھ گلی میں غبار بن کے میاں
ہجر کی خاک ہم نے چھانی ہے

مجھ کو تحلیل کر دیا پل میں
کیا عجب مرگِ نا گہانی ہے

دل میں ماتم کناں ہے حلقہ غم
تیرے جانے کی سوز خوانی ہے(۱۳)

کامران ندیم کی شاعری میں معاشرتی پہلو بیت نمایاں ہے وہ اپنی شاعری میں بیان کرتے ہیں کہ صنعتی ترقی کے ساتھ انسانی تنہائی اور معاشرت کا جو عمل بیسویں صدی کے آغاز میں شروع ہوا تھا وہ رفتہ رفتہ دنیا کے دور افتادہ خطوں تک پہنچ گیا۔ ٹیکنالوجی اور ذرائع ابلاغ کی ہوش ربا ترقی نے جہاں فاصلاتی وسعتوں کی کم کیا ہے۔ وہیں قریبی انسانی رشتوں میں لامحدود فاصلاتی وسعتوں کو جنم دیا ہے۔ کامران ندیم ماضی گزیدہ ہیں۔ قنوعی ہیں اور نہ ہی کسی جمودی فکر یا رجعت پسندانہ مکتب فکر کے دام کے اسیر ہیں اور اس ترقی یا ٹیکنالوجی کے مخالف بھی نہیں ہیں۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس ٹیکنالوجی کی اس ترقی میں انسانی رشتے اور انسانی اقدار بلکہ خود انسان بھی شاید ہیں بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ یہ کیفیت جسے آج ہم ترقی سمجھتے ہیں کہیں آنے والے عہد اس کو لایعنیت کے خانے میں تو نہیں رکھ دے گا۔

بیسویں صدی کے آخرت ٹیکنالوجی کے فروغ اور گلوبلائزیشن کی برکات کی بدولت تنہائی اور معائرت اس حد تک بڑھ گئی کہ انسان اپنی ذات سے بھی دور ہو چکا ہے۔ کامران ندیم آج کے حالات کے مطابق معاشی پہلو کو اُجاگر

کرتے ہیں کہتے ہیں کہ انسان کے جسمانی وجود اور اس کی ذات کے درمیان ایک ایسی غیر مرئی خلیج بنادی گئی ہے کی جس کا ادراک ہی بہت مشکل ہے۔ اگر اس کا ادراک ہو بھی جائے تو اسے ہاٹنا ناممکن نہیں تو دشوار تر ضرور ہے۔ انسان زندگی ڈیجیٹل گھڑی کے ہندسوں کی غلام ہو گئی۔ آپٹک فائبر اور ٹی ٹو، تاروں کے جال میں پوشیدہ رواں، ہانپتی سسکتی، ٹیکنالوجی کی یہ طلم ہوش رُبا دینا ایک بہت سنگین واہمہ بھی ہو سکتا ہے۔

ان کی شاعری میں حالات کی بے بسی کا ادراک ملتا ہے۔ لوٹ کھسوٹ لالچ، قتل، وغارت گری، دہشت گردی اور ظلم و جبر کے خلاف لکھتے ہیں کامران ندیم نے اپنی غزلوں میں تکرار حرفی و لفظی کا خوب استعمال کیا ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں لفظ ''وحشت'' کا استعمال بڑا عمدہ طریقے سے کیا ہے۔ ان کے کلام میں موسیقیت اور غنائیت پائی جاتی ہے جس سے ان کا کلام عمدہ لگتا ہے۔ اردو شاعری میں کلاسیکی شعرا سے لے کر جدید شعرا تک اس کا استعمال ہوا ہے۔

کامران ندیم لکھتے ہیں:

> ''آٹھویں جماعت میں جیسی تیسی شاعری شروع کر دی۔ کلاسیکی شاعری کی چاٹ ایسی لگی کہ ایف۔ اے تک اردو کے تمام قابل ذکر کلاسیکی شاعروں اور نثر نگاروں کا مطالعہ کر ڈالا، سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت کچھ پلے پڑا اور کچھ ہیں۔''(۱۴)

جب ظلم و ہولناک کی داستان حد سے بڑھ جاتی ہے تو وہ یہ خواہش کرتے ہیں کہ کسی طرح یہ اندھیرا ختم ہو اور صبح کا تارا دکھائی دے۔ وہ حال اور مستقبل کو سنوارنا چاہتے تھے۔ ان کے شعری مشورے کے حوالے سے دیکھا جائے تو وہ ہمیں معاشرتی ولا تعلق نہیں ہیں ان مسائل کے حل کے لیے جرأت اور استحصال کے طبقے کے خلاف جنگ کو ضروری خیال کرتے ہیں:

اک ستارہ کسی چشمِ چراں میں ہے
استعارہ کسی چشم حیراں میں ہے
شام وحشت میں ہمی ہوئی روشنی
پارہ پارہ کسی چشم حیراں میں ہے
شہر مرگِ مسلسل کا سود و زیاں
گوشوارہ کسی چشمِ حیراں میں ہے(۱۵)

ادب اظہار و ترجمان حیات ہے۔اس میں ادیب کے ذاتی تجربے، ماضی کا سارا سرمایہ، معاشرتی رویے، سیاسی عقائد، سماجی شعور اور تصورات شامل ہوتے ہیں۔ادیب ان کو اپنی تخلیقات میں ہمہ گیریت کے امتزاج سے پیش کرتا ہے۔ جس کا اثر لاشعوری طور پر معاشرے پر پڑتا ہے۔ان کی شاعری اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے ماحول کی ترجمان ہے۔ کامران ندیم اپنی شاعری میں اپنے جرأت مندانہ اسلوب کے ذریعے شاعری کے تاریخی ورثے کے امین اور انسانیت کے ترجمان بن کر سامنے آئے ہیں۔انھوں نے معاشرتی حقائق کو جس وسعت نظری سے دیکھا ہے وہ ان کا ہی خاصہ ہے۔

کامران ندیم شاعری میں ایک حکومت شکن شاعر کے روپ میں بھی متعارف ہوتے ہیں۔ جبر کی قوتوں کے خلاف ان کے رویوں نے ان کی شاعری میں معاشرتی بے چینی اور فرد کے استحصال کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں ''افرادِ دیگر'' سے ایک عمیق وابستگی کے عندیہ دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی جدوجہد کی تویدد یتی ہے۔ جس میں حریت کا جذبہ بھرا ہوا ہے۔

''مزاحمت'' لفظوں میں داخل ہو کر قاری کو اُمید بھی دلوائی ہے اور بنے بنائے ڈھانچے سے ٹکرانے پر بھی آمادہ کرتی ہے۔ذات کا احتجاج معروض کا رزم نامہ بھی بن جاتا ہے۔

کامران ندیم کی شاعری کا بنیادی نفس مضمون ''دہشت'' ہی ہے یہ دہشت اور خوف اور ڈر سے مختلف ہے۔اس میں ایک لایعینت بھی ہے اور ایک جمالیاتی دکھ اور کرب کا احساس بھی ہے یعنی دنیا میں انسان ہے تو مگر یہاں انسان نام ہی کوئی چیز ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شعر میں ڈھلتی ہوئی دہشت آزادی کی سلبی ہے جو مابعد الطبیعاتی آفاق میں شاعر کے تناظر میں دھندلی ہے۔ جو تشکیک سے عبارت ہے مگر یہ التباس ہے جو موضوعیت کا دھوکہ ہے شعر کا جمالیاتی تجربہ شعری متن کا سب سے اہم حصہ ہے جو دراصل ثبات و سکون ہوتا ہے۔ مگر اس میں طوفان پوشیدہ ہوتا ہے۔جو انسانی تجربے کی مکمل اور مستحکم وحدت ہے جو ایک وجودی بحران کا عندیہ دیتا ہے۔

اس شاعری میں ایک ایسی قنوطی خود کلامی کی حالت نظر آتی ہے جو دراصل زندگی کی روشنی اُمنگوں کی گہری معاشرتی خود کاریت کی کیفیت کا اظہار کرتی ہے۔بنیادی طور پر ان کی شاعری جدید دور کے کرب وافیت کی تثلیث کی نئی جہات دکھائی ہے۔ جب میں درد افسردگی خیال اور اُمید شامل ہے۔ان کی شاعری کے مطالعہ سے علم ہوتا ہے کہ معاشرے میں فرد تنہا اور لاعلم اور اس کی اپنی شناخت اور متعین راہ کھو چکی ہے۔ اگرچہ ان کی غزلیں کلاسیکی غزل کی روایات میں کندھی ہوئی ہیں لیکن ان میں جدید دور کا المیاتی لہجہ لاتشکیلیت کی سطح پر تصوراتی التباس کو ابھارتا ہے۔

رومانویت کلاسیکیت کی ضد ہے۔ رومانویت کی تحریک اٹھارھویں صدی میں مغرب میں جاری تھی۔ یہ

سماجی، سائنسی اور اخلاقی اصطلاحات کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی لیکن سب سے زیادہ اس سے فنون متاثر ہوئے۔ یہ عقل، سائنس اور اقدار و روایات کے خلاف وسعت پذیر بغاوت تھی۔ فن میں بہت گہری نوعیت کی تبدیلیاں ہوئیں۔اس طرح رومانویت نے فن کے طور پر اپنے آپ کو منوایا۔

رومانویت کا لفظ دراصل رومان سے نکلا ہے اور رومانس کا لفظ رومن زبان سے مشتق ہے۔اس کے معنی جنوبی یورپ کی جدید زبانوں کے لیے بولے جاتے ہیں۔ مثلاً جو رومی، لاطینی اور رومانی زبانوں سے مل کر بنی ہو۔اس لفظ کا دوسرا استعمال ان زبانوں اور رومانی زبانوں سے مل کر بنی ہو۔اس لفظ کا دوسرا استعمال ان زبانوں میں سے کسی زبان کی کہانیوں کے لیے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر کوئی بھی خیالی افسانہ یا ناول جس کی بنیاد ق زندگی اور اس کے حقیقتوں سے دور ہو یا خیالی نظم و نثر، حقیقت سے مبالغہ آرائی، عشق اور محبت کا معاملہ ہو، تخیل پرستی اور رنگ آمیزی کو رومانس کہتے ہیں۔

رومانیت کے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ''میری سمجھ میں رومانیت کا مطلب یہ ہے کہ ایسا اظہار اُسلوب جس میں فکر کے بجائے تخیل پر زور دیا جائے اور اس کا جدھر بہاؤ ہو دریا کی طرح بہنے دیا جائے اس میں قاری بھی بہہ جاتا ہے۔''(۱۶)

احتشام حسین کے نزدیک رومان سے مراد حسن و عشق کا افلاطون اور تخیلی بیان نہیں بلکہ روایت سے بغاوت نئی دنیا کی تلاش، خوابوں اور خیالوں سے محبت ان دیکھے حسن کی جستجو آزادی خیال، حسن سے تا یہ مقدر و لطف اٹھانے میں ناآسادگی کا احساس اور کرب ان سب کو رومانیت کہتے ہیں۔

دلوں تو زندگی کے سبھی حقائق غزل کا موضوع بن سکتے ہیں۔ لیکن جو اہمیت ہر عہد میں عق مجازی کو حاصل رہی وہ کسی اور موضوع کو حاصل نہ ہو سکی۔ عشق اردو غزل کا محبوب موضوع ہے یہ جذبہ پوری کائنات پر محیط ہے۔

یوسف حسین خاں لکھتے ہیں:

> ''غزل گو شاعر کے نزدیک عشق پوری زندگی پر حاوی ہے۔ زندگی نام ہے علائق کا جہاں تعلق ہو گا وہاں جذبہ ہو اور جہاں جذبہ ہو گا وہاں کسی قسم کا تعلق ضرور ہو گا۔ جس طرح خلوف کے مظاہر اور ان کی قوتیں علائق کی زنجیر میں بندھی ہوتی ہیں۔اسی طرح زندگی بھی تعلقات کی سنہری ڈوریوں میں جکڑی ہوتی ہیں۔ یہ تعلق فطری بھی ہے اور معاشرتی بھی۔''(۱۷)

جنس اردو شاعری کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔اردو کا شاید ہی کوئی شاعر یا ادیب ہو جو اس موضوع سے لبرد

آزماءہ ہوا ہو۔ بالخصوص اردو شاعری میں اس کیفیت کو عموماً دبیز پردوں میں پیش کیا گیا ہے۔ اردو شاعری میں فنکارانہ ہئیت کے طور پر جنسی جذبے کا اظہار پر جمال تو ضرور ہے لیکن یہ کسی محرومی یا خواب بیداری کا واہمہ بھی ہوتا ہے۔ جس سے نفسی دہشت اور وحشت ہی برآمد ہوتی ہے یہ اظہار مخصوص نفسیاتی اور عمرانیاتی اسباب کے پس منظر میں معاشرتی احوال کی منظر کشی کرتا ہے۔ کامران ندیم کی شاعری میں جنسی رویوں کے اجزاء بکھرے ہوئے تو ہیں لیکن ان اجزا کے بکھراؤ کے سبب شعور بھی بکھرا بکھرا نظر آتا ہے۔ جو دراصل نفسی شکست کی داستان کو بیان کرتا ہے۔ لمس کی خواہش ان کے جذبہ اشتہا کو ابھارتی ہے۔ لگتا ہے کہ جنس فطرت کا عطیہ ہے اور شاعر اس کو مقدس تصور کرتا ہے اور اسے اجتہاد نفس تک لے آتا ہے۔ ان کی شاعری میں جنسی رویہ انبساط بھی پیدا کرتا ہے اور یہی رویہ ان کے خوابوں کو بکھیر بھی دیتا ہے۔ کامران ندیم کا یہ جذبہ شدید اس لیے بھی ہے کہ اس میں لاشعور کا باغی چھپا ہوا ہے۔ ایک آزاد خواہش اور اس کو رد عمل پر شاعر حیرانی اور پریشانی کا خدشہ محسوس کرتا ہے مگر وہ عشق کو معروض بنا کر اپنے جذبوں کی نامیات کو دبا دیتا ہے۔ جس سے فرد آگاہی ہوتے ہوئے بھی آگاہ نہیں رہنا چاہتا۔

اک بدن کے دریچے کھلے تو ندیم
کیا نظار کسی چشم حیراں میں ہے

اس بدن کی گھاٹی میں، ماہتاب روشن تھا
حیرتی نگاہوں میں اب کہاں اندھیرا ہے(۱۸)

رومانویت کی آر میں جنسی جذبوں کا اظہار اردو شاعری میں دلچسپی اور انوکھا مشغلہ ہوتا ہے جو دراصل اظہار ذات ہوتا ہے۔ اس میں معروضی تناظر داخلی ارتعاش کا سبب بنتا ہے۔ جنس کی رومانویت میں خوابی مشبیہ کاری اور تمدنی رکھ رکھاؤ کے درمیان ایک المناک معانقہ شاعر کے فکر و خیال کو توازن دیتا ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شاعر کے نفس اور خوابوں سے برآمد ہونے والی چنگاریاں یاسیت کی شاعرانہ تہذیب کو جنم دیتی ہیں۔ جہاں زور رنجی بھی ہے اور تمدنی معنوعیت کا ماتم بھی۔ شاعر کے لیے جنسیاتی رویہ حیرانی اور تجسس کا سبب ہے۔ یہ ایک ایسا جمالیاتی تجربہ ہے کہ جوان کے رومانی اظہار کو رنگا رنگی عطا کرتا ہے۔ شاعر نے اپنے محسوسات، حسیات اور مشاہدات کو بڑ قرینے سے پیش کیا ہے:

رات کو پہلو میں اک تصویر روشن ہو گئی

خواب تو دیکھا نہیں تعبیر روشن ہو گئی

اس بت کافر کو جو دیکھا بہت نزدیک سے
نقش گر کی شوخی تحریر روشن ہو گئی(۱۹)

ہر عہد میں غزل کا مرکزی موضوع حسن و عشق ہے۔البتہ امکانات کا دائرہ وسیع ہے۔ شاعری کی فکری و فنی استطاعت پر منحصر ہے کہ وہ اپنے انفرادی نقوش کیسے اُجاگر کرتا ہے۔ حسن و عشق کی اس ورادات میں ذاتی اور خارجی حوالے سے کیسے ایک دوسرے سے مل کر ایک قدرتی احساس پیدا کرتے ہیں۔

اردو شاعری میں عاشق کو وصل کے لمحے مختصر جبکہ جدائی کی راتیں طویل لگتی ہیں۔ یہی صورت حال کامران ندیم کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے۔ کامران ندیم فیض احمد فیض کی شاعری سے بے حد متاثر تھے۔ فیض کے ہاں غم جاناں اور غم دوراں ایک ہی پیکر میں یکجا ہیں۔ انھوں نے محبت اور انقلاب کے ترانے بیک وقت گنگنائے ہیں۔ فیض کا فنی کمال یہ ہے کہ انھوں نے کلاسیک اور رومانیت کو قالبِ شعر میں ڈھال کر ایک منفرد اسلوب اور لہجہ تخلیق کیا ہے۔ فیض اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جب رومان و انقلاب ایک شاعر کے فن اور ذات میں ڈھل جاتے ہیں تو ترقی پسند شاعری پیدا ہوتی ہے۔ وہ سستی جذباتیت اور نعرہ بازی کے خلاف ہیں وہ صرف انقلاب کا نعرہ بلند کر کے کشت و خون کی دعوت دیتے نظر نہیں آتے بلکہ وہ نرم اور کومل الفاظ میں ہمیں انقلاب کے راستے سے روشناس کرواتے ہیں۔ فیض اپنے تنقیدی مضامین کے مجموعے ''میزان'' میں لکھتے ہیں:

> ''انقلابی شاعر پر حسن و عشق یا مے و جام حرام نہیں اور اس پر یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ انقلابی مضامین کے علاوہ دوسرے تجربات اور دوسری واردتوں کا ذکر نہ کرے۔''(۲۰)

اس کے علاوہ کامران ندیم جون ایلیا کی شاعری سے بے حد متاثر تھے۔ جون ایلیا کی شاعری کی بڑی خوبی یہ تھی جس کی وجہ سے کامران ندیم ان سے متاثر ہوئے نہ رہ سکے کہ وہ اپنے محبوب سے براہِ راست مخاطب ہونا پسند کرتے تھے۔ انھوں نے دوسرے شاعروں کی طرح بادلوں، ہواؤں اور پھول و خوشبو کو ذریعہ خطابت بنانے سے پرہیز کیا۔ تلخ حولات ہوں اور اپنی طبیعت و احساس کا اظہار کرنا ہو تو انھوں نے اپنے محبوب کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھ کر بات کی ہے اور وہ بھی بالکل مختلف انداز میں۔

بن تمہارے کبھی نہیں آئی

کیا مری نیند بھی تمہاری ہے(۲۱)

عشق و محبت کے حوالے سے محبوب کی یادیں عاشق کا قیمتی سرمایہ ہوتی ہیں۔ ہجر کے شب و روز ان یادوں کے سہارے بسر ہوتے ہیں اور اگر انسان کی ان یادوں کی فراموش کرنا چاہے تو بھی فراموش ہیں کر سکتا۔

وصل یار کی ساعت، خود ہی جگمگاتی ہے
روشنی نہیں تو کیا مہرباں اندھیرا ہے(۲۲)

کامران ندیم نے اردو غزل میں عشق و محبت اور رومان کے موضوع کو نئی جدت سے ہم کنار کیا ہے۔ لفظوں کی خوبصورتی کیفیات و تجربات کی خوبصورتی کو چار چار لگا دیتی اور روانی سے شعر پڑھے جاتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں محبوب کی تصویر اس طرح سے کھینچتے ہیں کہ انھیں محبوب سے ملنا کسی مہرباں اندھیرے سے کم نہیں لگتا۔

حوالہ جات

1. کامران ندیم، وحشت ہی سہی، لاہور: بک سٹریٹ ۲۰۲۱ء، ص ۱۳
2. ایضاً
3. کامران ندیم، وحشت ہی سہی (مقدمہ)، لاہور، سانجو پبلی کیشنز، ۲۰۲۱ء، ص ۱
4. ایضاً، ص ۱۵
5. ایضاً
6. ایضاً، ص ۱۸
7. کامران ندیم، وحشت ہی سہی (دیباچہ)، لاہور: بک سٹریٹ ۲۰۲۱ء، ص ۰۲
8. ایضاً، ص ۱۷
9. ایضاً، ص ۱۸
10. ایضاً، ص ۲۱
11. ایضاً
12. ایضاً، ص ۱۴
13. ایضاً، ص ۴۵
14. ایضاً، ص ۲۳
15. ایضاً، ص ۸۱
16. عبداللہ، ڈاکٹر، سید، اشارات تنقید (دوسرا ایڈیشن)، لاہور، خیابان ادب، ۱۹۸۲ء، ص ۸۳
17. یوسف حسین، اردو غزل، لاہور، القمر انٹر پرائزز، س ن، ص ۵۷_۶۹
18. ایضاً، ص ۱۶
19. ایضاً، ص ۱۵۳
20. فیض احمد فیض، میزان، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۵۔۱۹۶۰، ص
21. https://www.qaumiawaz.com Dated:9Nov 2017, time: 1:17 PM
22. کامران ندیم، وحشت ہی سہی، ص ۱۵۲